ہر اتوار
آپ کی خدمت میں
لازوال ادب
ترتیب و پیش کش
غلام نبی کمار
معاون مدیر: لازوال ادب
فون نمبر۔7053562468
ای میل۔lazawalada04@gmail.com

گوپی چند نارنگ، غالب اور دانش ہند

قسط اول

"تخلیقی عمل؛ بھید بھرا بستہ ہے۔ تنقید اس کی تھاہ لانے کا دعویٰ نہیں کر سکتی"

تخلیق اور تنقید کے حوالے سے 'یہ بچ'، پروفیسر گوپی چند نارنگ نے غالب شناسی کے حوالے سے، اپنی تصنیف "غالب؛ معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات" میں لکھا ہے۔ قول ہے کہ: "منجھا ہوا مصور رنگوں کے انتخاب کے لئے ستر ستر کنوؤں کو جھانکتا ہے، غیر معمولی نقاد بھی، (جیسے کہ گوپی چند نارنگ ہیں) متن اور معنی کی سو سو تہوں اور طرفوں کو کھول کر، ایسے تنقیدی نتائج سامنے لاتا ہے، جو کسی کے گمان میں بھی نہیں ہوتا۔" غالب؛ معنی آفرینی۔۔۔۔اس کی بہترین مثال ہے۔ لیکن پروفیسر نارنگ کی اس تصنیف کی 'تھاہ' لانے کا عمل بھی اُن کے تنقیدی اجتہادات و انکشافات کے بحر بیکراں کی لہریں شمار کرنے سے زیادہ دشوار عمل ہے۔ اب تک "بالعموم غالب کو وہاں ڈھونڈا جاتا رہا تھا، جہاں روشنی تھی، جہاں سب معلوم تھا۔ لیکن پروفیسر نارنگ کے تنقیدی شعور کی رسائی وہاں تک ہوئی ہے، جہاں غالب شعریات میں سب کچھ روشنی میں نہیں تھا"۔ غالب کا یہ کہنا کہ،

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

دراصل غالب کی شاعری میں نشاطِ تصور کی گرمی ہر دور اور ہر ماحول میں قارئین کو کسی نہ کسی زاویے سے لازماً متحرک کرتی رہی ہے۔ کیونکہ 'برصغیر' کے شاعروں میں اقبال اور ٹیگور سے قطع نظر، غالب کی ہی شاعری ہے جو آج، کہیں بھی، کبھی بھی کسی بھی قماش کے انسان کے ساتھ چلنے کی 'قوت' رکھتی ہے۔ آج بھی زندگی جینے کے عمل میں جب کبھی کوئی مشکل مرحلہ آتا ہے، غالب کا کوئی نہ کوئی شعر ہمارا ہاتھ تھام لیتا ہے۔ غالب کی شاعری، تمام تر زمانی اور مکانی ہی نہیں، لسانی اور فکری حد بندیوں سے ماورا شاعری ہے لہٰذا دو، سوا دو سو برس گذر جانے کے بعد بھی اگر غالب دنیا بھر کے قلم کاروں کو اپنے "ہم عصر" ہونے کا احساس کرواتا ہے تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ غالب کے فکر و فن میں ایسا بہت کچھ ہے جو ابھی تک 'غیاب' میں تو تھا، لیکن انہیں 'حضور' میں لانے کے بارے میں کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کے لئے غالب کی شعریات کے ان پہلوؤں کو بھی چشم بینا سے دیکھنا لازمی تھا جو ابھی تک ہمارے ناقدین کے حیطۂ خیال میں بھی نہیں آیا تھا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے "غالب؛ معنی آفرینی۔۔۔۔۔میں کلام غالب کے ایسے ہی نادیدہ اور ان چھوے پہلوؤں کو سامنے لا کر غالب کے 'ذہن اور زبان کی جدلیت' کے حوالے سے غالب کی شعریات میں 'دانش ہند' کی بازیافت کا کارنامہ انجام دیا ہے۔

ایک ایسے وقت میں جب کہ تخلیقی عمل کو ممیز کرنے اور عصری ادب کی معنی آفرینی اور شعریات کی نئی تشکیل کے حوالے سے اردو تنقید پر "شونیتا" خالی پن' کی کیفیت طاری نظر آ رہی ہو، گوپی چند نارنگ کا تخلیقی عمل کو "بھید بھرا بستہ" قرار دیتے ہوئے تخلیق کی تہوں کو کھولنے میں تنقید کی ناکامی کا ذکر کرنا معاصر تنقید کی نارسائیوں کا شکوہ بھی ہے اور تخلیقی ادب کی منصفانہ تفہیم و تعبیر کے باب میں نئے ناقدین کو، سہل پسندانہ رویہ بدلنے کی تاکید بھی۔ حالی، کلیم الدین احمد اور احتشام حسین کے بعد، شمس الرحمٰن فاروقی سے الگ، پروفیسر گوپی چند نارنگ ہی وہ نقاد ہیں جنہوں نے اردو زبان، اور شعر و ادب کے حوالے سے اس قدر وافر تنقیدی سرمایہ لکھ چھوڑا ہے جسے پڑھنے اور سمجھنے کے لئے غالباً انسان کی ایک عمر کافی نہیں ہوگی۔ کیونکہ خود گوپی چند نارنگ کی تنقید، علمیات اور بصیرت مندی کے اعتبار سے "بھید بھرا بستہ" ہے۔ اس 'بستہ' کو کھولنے، اور ان کے بیان کردہ نکات کی 'تھاہ' تک پہنچنے کے لئے لسانیات، اسلوبیات اور شعریات کے تناظر میں اپنی مٹی، اپنی زمین پر پاؤں جما کر ادب کے آسمان کو اپنی مٹھی میں لینے کی جدوجہد تو کرنی ہی پڑتی ہے، ساتھ ہی ان مختلف و متضاد فکریات کو بھی ذہن میں رکھنا ہوتا ہے جن کی آویزش و آمیزش سے اردو شعریات میں دانش ہند کی کونپلیں پھوٹی ہیں۔ کیونکہ ایسی ریاضت کے بعد ہی تنقید کی رسائی، شعر و ادب کی ان جڑوں تک ممکن ہو پاتی ہے جن پر شعریات کا پیڑ قائم ہے۔ پروفیسر نارنگ کی تصنیف "غالب؛ معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات" اس کی عمدہ مثال ہے۔ واقعتاً مولانا حالی کے بعد گوپی چند نارنگ ہی وہ نقاد ہیں جنہوں نے آزادی/تقسیم ملک کے بعد کے منظر نامہ کے حوالے سے، اپنی تنقیدات کے ذریعے، اردو میں "تھیوری" یا نظریہ سازی کی اہمیت اور معنویت کو واضح کیا اور ادبی تخلیقات کی تعبیر و تفہیم کے نئے اصول و ضوابط کی تشکیل کے امکانات روشن کئے۔ حالی نے ۱۸۹۳ء میں "مقدمہ شعر و شاعری" لکھ کر اردو میں نظریہ سازی کی بنیاد رکھی تھی لیکن اس کے بعد مغربی علوم و فنون، تعلیم اور تہذیب و ثقافت کی تیز رفتار توسیع و اشاعت کے سبب روشن خیالی تو آئی لیکن اردو ادب کی مشرقی شعریات، خصوصاً "دانش ہند" کی جڑیں مسلسل کھوکھلی بھی ہوتی رہیں۔ فارسی زبان و ادب سے بتدریج برحتی ہوئی عدم دلچسپی کے سبب بیدل اور غالب سمیت فارسی شعرا و ادبا کے کارنامے پردے کے پیچھے ہی رہے۔ سرسید کی علی گڑھ تحریک سے لے کر ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے رجحان کے عروج اور زوال تک، اردو کے تخلیقی ادب کے سرمایہ میں مستقل اضافہ تو ضرور ہوتا رہا، لیکن ساتھ ہی پیروئی مغرب میں شدت پسندی، زبان کے لسانی برتاؤ، اسالیب، موضوعات و معاملات (ڈسکورسیز) کے انتخاب اور اظہار و بیان کے پیرایوں سے متعلق نظریات و تصورات کے وفور نے اردو تخلیق کاروں کو بے سمتی، تشکیک اور انتشار میں بھی مبتلا کر دیا تھا۔ تقسیم ملک کے خونیں نتائج، اردو اور اردو آبادی کے مسائل اس پر مستزاد تھے۔ مزید برآں اردو ادب میں تقلید اور یکسانیت کے سبب جمود اور باسی پن کی جو کیفیت پیدا ہوئی اس کی بنا پر محمد حسن عسکری اور قرۃ العین حیدر جیسے معتبر قلم کاروں اور دانشوروں کی جانب سے اردو میں 'ادب کی موت' کے اعلان کی باتیں بھی ہونے لگی تھیں۔ "جدیدیت" کے نام پر اکثر و بیشتر تخلیق کار 'خرافات' میں کھو گئے۔ اور 'ہند و پاک جیسے پس ماندہ منطقوں میں کم و بیش دو دہائیوں تک اردو میں شعر و ادب کی تخلیق گویا 'کرائے کی کوکھ' سے ہوتی رہی۔ اس صورت حال میں گوپی چند نارنگ نے "مقدمہ شعر و شاعری" کی اشاعت کے ٹھیک سو سال بعد ۱۹۹۳ء میں "ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات" لکھ کر گویا اردو ادب میں ایک نئی روح پھونک دی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے "ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات" کے دیباچے میں جو کچھ لکھا تھا اس کی معنویت آج بھی برقرار ہے، "۔۔۔مقدمہ نے عہد سرسید کی اصلاحی اور اخلاقی شعریات کی تشکیل تو کی ہی تھی بعد کی دونوں تحریکوں (ترقی پسندی اور جدیدیت) میں بھی اختلاف و اتفاق کے زیادہ تر مقامات مقدمہ سے ہی فراہم ہوتے رہے۔۔۔۔جس علمی شان اور روایت آگہی سے حالی نے اپنے عہد کی تھیوری کی تشکیل نو کی تھی، ویسی توجہ نہ ترقی پسندوں نے اپنی تھیوری پر کی تھی اور نہ جدیدیت پسندوں نے۔۔۔۔اس بات کو فراموش کر دیا گیا کہ زندہ زبانوں کی ثقافت ہو یا شعریات یہ اندر سے بند نہیں ہوتیں، یہ جامد نہیں ہوتیں، نئے اور پرانے کی آویزش و پیکار سے ان میں خود انضباطی اور ہم آہنگی کا جدلیاتی عمل برابر جاری رہتا ہے۔ اور سابقہ بنیادوں پر نئے معیار بنتے رہتے ہیں، اور سابقہ معیاروں کی باز آفرینی بھی ہوتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر آج کی اردو شعریات سو فی صدی وہ نہیں ہے جو حالی، آزاد، شبلی یا نذیر احمد کے کے زمانے کی شعریات تھی، بالکل اسی طرح جیسے حالی اور ان کے معاصرین کی شعریات بھی وہ نہیں تھی، جو نظامی، وجہی، محمد قلی، غواصی یا نصرتی کے زمانے کی شعریات تھی۔ تغیر و تبدل اور تازہ کاری کا عمل، مردہ زبانوں میں تو رک جاتا ہے، لیکن زندہ ادبی روایتوں کی اندرونی حرکیت سے یہ برابر جاری رہتا ہے۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اردو ایک زندہ زبان ہے۔"

(دیباچہ۔ ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات ص۔ ۹،۱۰)

پروفیسر قدوس جاوید

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ۱۹۹۳ء میں "تھیوری" یا دوسرے لفظوں میں "مابعد جدیدیت" کا جو بیج بویا تھا وہ اب تناور درخت بن چکا ہے۔ مابعد جدید تھیوری کی شاخیں اور گل و ثمر نارنگ صاحب کی دوسری ایک درجن سے زائد تصنیفات میں تو ملتی ہی ملتی ہیں، ساتھ ہی انہیں کے تسلسل میں وہاب اشرفی، عتیق اللہ، ابوالکلام قاسمی، فہیم اعظمی، ش۔ک۔ نظام، نظام صدیقی، شافع قدوائی، بیگ احساس اور ناصر عباس نیر وغیرہ کے یہاں بھی اس آفتاب تازہ (مابعد جدیدیت) کی کرنیں ملتی ہیں۔ لیکن پھر بھی معاملہ "ادبی تنقید اور اسلوبیات" کا ہو یا "ادب اور ساختیات" کا، مابعد جدید تھیوریز کا ہو یا امیر خسرو، میر، انیس، اور غالب کسی بھی شاعر کی شعریات اور فکریات کی جڑوں کی بازیافت کا، پروفیسر نارنگ ہمیشہ ہی تحقیق و تنقید کے نئے زاویے نکالتے ہی رہے ہیں، کہ یہی تنقید کا منصب ہے۔ اس باب میں اردو میں کوئی اور ان کا ثانی نہیں۔ یوں تو پروفیسر نارنگ کی تمام تصنیفات پر فرداً فرداً بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ اسی طرح پروفیسر نارنگ کے تنقیدی نظریات و تصورات پر بھی اردو کے علاوہ بھی کئی ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں بھی مستقل لکھا جا رہا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ نارنگ صاحب کی ذات میں، اردو زبان، شعر و ادب اور انسان اور انسانیت کے تحفظ کے تئیں تجسس اور لگن کی جو حرارت ہے وہ انہیں ہمیشہ، ہر لمحہ فعال اور متحرک رکھتی ہے۔ "آج کے منظر نامہ پر نازی ازم کی بدنام زمانہ خونریزی کے بعد ZIONISM صیہونیت اور اس نوع کے تمام لسلی اور فرقہ وارانہ رجحانات فاشزم، نسل پرستی اور علاقائیت کی بدترین شکلیں ہیں جو حقانیت کی اپنی اپنی اجارہ داری، عصبیت اور برتری کے نام پر لاکھوں کروڑوں بے گناہوں اور معصوموں کا خون بہانے کو جائز سمجھتی ہیں، اور جنہوں نے شدت پسندی اور فتنہ و فساد کو پھیلا کر انسانیت کو شرمسار اور زمین کو داغدار کر دیا ہے۔ اکیسویں صدی میں فرقہ واریت، دہشت گردی، استعماریت اور تشدد کا منظر نامہ سب سے اذیت ناک منظر نامہ ہے۔ لوگوں نے خدا کو الگ الگ بانٹ لیا ہے، اپنے اپنے بت تراش لئے ہیں اور جس آزادی کو وہ اپنے لئے جائز سمجھتے ہیں، دوسروں کے لئے اسی کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ اکیسویں صدی کا سب سے بڑا چیلنج انسانیت کی آزادی، بوقلمونی اور تکثیریت کا تحفظ ہے۔ اس منظر نامہ میں غالب کے جدلیاتی ڈسکورس کی معنویت، اس کی بے لوثی، وسیع المشربی اور آزادگی و کشادگی کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔"

(گوپی چند نارنگ۔ غالب؛ معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات "ص۔ ۲۵)

یہی وجہ ہے کہ درازئ عمر کے باوجود انہوں نے برسوں کی دیدہ ریزی سے کام لے کر، ہر دور میں عظمت و انفراد کی بلندیوں پر فائز رہنے والے مرزا اسد اللہ خاں غالب پر ایک ایسی مجموعہ روزگار کتاب لکھ دی ہے، جس میں فکر غالب کے نادیدہ اور 'غیاب' (شونیتا) میں 'حاضر' "دانش ہند" تک رسائی کے لئے بصیرتوں کے چراغ جا بہ جا روشن ہیں اور جن سے غالب شناسی کے باب میں اردو دنیا ہمیشہ کسب فیض کرتی رہے گی۔ اس بات کا احساس خود پروفیسر نارنگ کو بھی تھا اسی لئے انہوں نے اس کتاب "غالب؛ معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات" کے دیباچے میں ہی قارئین پر یہ واضح کر دیا ہے کہ

"غالب کا کلام جام جہاں نما ہے۔ غالب کے اشعار میں نہایت دقیق، دور رس اور پیچ در پیچ معانی کی حیرت زا اور عمیق دنیا آباد ملتی ہے۔ غالب کے بارے میں سب سے بڑا سوال جس کا کوئی آسان جواب نہیں، یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے؟ جو جوکوندے کی طرح لپکتی ہے اور شبستان معنی کو روشن کرتی چلی جاتی ہے، اس طور کہ پڑھنے والا دم بخود رہ جاتا ہے۔" (غالب؛ معنی آفرینی۔۔۔۔ص۔ ۱۳)

دراصل یہی وہ سوال ہے جو نارنگ صاحب کو غالب کے ذہن اور لاشعور میں پیوست ان تہذیبی اور فکری تہوں تک لے جاتا ہے جن کی طرف آج تک، غالب کے ہزار ہا ناقدین میں سے کسی کے گمان کی بھی رسائی نہیں ہوئی تھی۔ اگوپی چند نارنگ نے اپنی اس تصنیف میں سب سے پہلے اسی سوال سے بحث کی ہے۔ نارنگ صاحب لکھتے ہیں، "میر و غالب ہوں یا انیس و آتش، غور طلب ہے کہ کیا ان کا ذہن و لاشعور اپنی مٹی سے بنا ہوا نہیں ہے؟ اس میں گندھا ہوا نہیں ہے؟ یا پھر کیا اس سے یکسر بے نیاز و بے تعلق دکھایا جا سکتا ہے۔ یا کسی دوسرے کا ظل ثانی ثابت کیا جا سکتا ہے۔۔ اہل فارس تو ہمارے شعرا کو مزاجاً مختلف سمجھتے اور "سبک ہندی" کا نام دھرتے ہیں۔ لیکن ہم ہیں کہ اپنی تخلیقی انفرادیت کو پہچاننے سے گریز کرتے ہیں اور کھل کر اس مسئلہ پر گفتگو نہیں کرتے۔۔۔۔۔غالب کے 'منہ بولتے ایرانی و تورانی عناصر اچھی طرح معلوم ہیں اور ان کا وجہ افتخار ہونا بھی عین حق ہے، لیکن جڑوں کا خاموش عمل دخل بھی تو کچھ معنی رکھتا ہے، ان کو دیکھنے دکھانے پر توجہ نہیں کے برابر رہی ہے۔"

(گوپی چند نارنگ؛ غالب؛ معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات۔ ص۔ 52)

ہر چند کہ نارنگ صاحب کے تنقیدی رویے کا یہ کوئی بالکل ہی نیا پہلو نہیں ہے۔ میر، غالب، انیس، اقبال یا فیض کوئی بھی شاعر کیوں نہ ہو گوپی چند نارنگ نے اس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اس کی دیدہ و ظاہری گل و ثمر کی شیرینی و عطر بیزی کو ہی نہیں، نادیدہ جڑوں کے خاموش لیکن کلیدی عمل دخل کو بھی ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے۔ اسی لئے مرحلہ اسلوبیات میر" کا ہو یا غالب کی معنی آفرینی کا یا انیس اور خسرو شناسی کا گوپی چند نارنگ شاعر کے تخلیقی عمل کے ان گوشوں کو بھی اپنی تنقیدی نظر اور نظریے کی گرفت میں لینے میں کامیاب ہوتے ہیں جہاں پہنچتے ہوئے دوسروں کی نگاہیں ہانپنے لگتی ہیں۔ گوپی چند نارنگ کی تصنیف "غالب؛ معنی آفرینی۔۔۔۔۔۔۔اس کا بین ثبوت ہے۔ گوپی چند نارنگ کے اس معجزاتی کارنامے سے قبل غالب کے جیتے جی اور اس کے ہستی سے نیستی کی جانب سفر کے بعد، گذشتہ دو سو سال سے زائد عرصے میں مرزا پر کیا کیا اور کتنا کچھ، اچھا برا نہ لکھا گیا لیکن نارنگ صاحب نے "تفہیم غالب" کے لئے جو نئے زاویے اختیار کئے وہ ان کے اختراعی و اجتہادی تنقیدی شعور کا ثمرہ ہے۔ اور یہ ثابت کرتا ہے کہ ایسا بے مثل تنقیدی شعور نارنگ سے قبل، اور بعد ان کے کسی اور معاصر نقاد کے یہاں مشکل سے ہی ملے گا۔ اردو میں مابعد جدید تھیوری کی زائیدہ نگاہ شوق کو شریک بینائی کر کے، سوسیر کے 'نظریہ لسان، رولاں بارتھ کے 'رد تشکیل' اور دریدا کے نظریۂ التوا' (Differance) کے حوالے سے، کاروبار جہان ادب کا نظارہ کرنے والے گوپی چند نارنگ ہی غالب کی شعریات کے بارے میں یہ کہہ سکتے تھے کہ: "متن وقت کے محور پر معنی گستری میں مصروف ہے۔ معنی مسلسل التوا میں رہتا ہے لیکن معنی پروری بے تقاضا قرات ممکن نہیں۔۔۔۔۔۔۔غالب کے متن کی تعبیریں وقت کے ساتھ بدلتی رہی ہیں۔ بجنوری کا غالب وہ نہیں ہے جسے حالی نے پڑھا تھا، اور، حالی کا غالب وہ نہیں جسے نظم طباطبائی، تجدد دہلوی سہا مجددی، حسرت موہانی، نیاز فتح پوری یا شیخ اکرام نے پڑھا۔ اور تو اور خورشید الاسلام، پریگانا، وارث کرمانی کا غالب بھی وہ نہیں جو کلیم الدین احمد، احتشام حسین، آل احمد سرور، ظ۔ انصاری، باقر مہدی یا شمس الرحمٰن فاروقی کا ہے۔" (گوپی چند نارنگ؛ غالب۔ معنی آفرینی ۔۔۔۔ص۔ 23,24)

تب، سوال یہ قائم ہوتا ہے کہ "غالب کون ہے؟ اور اس کی شعریات میں "دانش ہند" کی اصل کیا ہے؟

جواب: گوپی چند نارنگ نے دیا ہے۔ غالب؛ معنی آفرینی۔۔۔۔۔۔میں نارنگ نے غالب کو، ایران و توران کی سیر سے واپس لا کر قدیم ہندوستان/ دانش ہند کے بھولے بسرے فکری و نظریاتی مباحث میں ڈھونڈ کر نکالا ہے "ویدک کال" اور بودھ کال" کی زائیدہ ہندوستانی فکریات میں غالب کے مضامین کی جڑوں کی بازیافت کو ایک معجزہ نہیں تو اور کیا کہیں گے؟ یوں بھی گوپی چند نارنگ ہمیشہ سے معجزے ہی تو کرتے آئے ہیں، پروفیسر شافع قدوائی نے درست لکھا ہے کہ،

"۔۔۔۔۔۔پروفیسر گوپی چند نارنگ ہمیشہ سے عمومیت زدہ رواج عام سے ہٹ کر چلتے آئے ہیں۔ مانوس اور مقبول تصور نقد یا رائج تصورات کی بے مائگی اور تضادات کو خاطر نشان کرنا اور ادب کی تفہیم کے نئے فکری منہاج ہویدا کرنا پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تنقیدی ژرف نگاہی (Critical Acuity) کی قابل رشک امتیازی صفت رہی ہے۔ مسئلہ خواہ ترقی پسند تصور ادب کا ہو یا جدیدیت کی فکری اساس کا یا فکشن کی شعریات کی تشکیل کا یا پس ساختیاتی مباحث کے مختلف ادبی اصناف پر تخلیقی اطلاق کا، پروفیسر نارنگ نے ہمیشہ متن کے گہرے اور خیال انگیز تجزیوں سے تنقید کا ایک تازہ کار نیا ماڈل اور محاورہ قائم کیا ہے، جو تعمیم زدگی یا محض نظری مباحث کی گونج سے آباد نہیں ہے، بلکہ ان کے یہاں بنیادی ہدف متن کا مرتکز مطالعہ ہے۔" (جاری)

پروفیسر گوپی چند نارنگ: چند یادیں چند باتیں

پروفیسر وہاب اشرفی صاحب اور عبد الصمد بھی مجھ سے "اردو بھون" میں آ کر ملے تھے۔ اس موقعے پر پروفیسر وہاب

پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کی وفات سے یوں تو پوری اردو دنیا سوگوار ہے، لیکن ان کی وفات سے مجھے ذاتی طور پر بہت صدمہ ہوا ہے۔ ان کے جیسی عظیم شخصیت کا دنیا سے اٹھ جانا اردو زبان و ادب کا ایک ایسا خسارہ ہے، جس کی تلافی مستقبل قریب میں ناممکن نظر آ رہی ہے۔ وہ اردو زبان سے از حد محبت کرتے تھے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ قدرت نے ان کو اردو زبان کی خدمت کے لیے ہی پیدا کیا تھا۔ وہ اردو زبان سے محبت اور چاہت کی ایک ایسی داستان چھوڑ کر ہم سے رخصت ہوئے ہیں جو داستان کبھی ختم نہ ہوگی اور ہمیشہ سنہری حرفوں سے لکھی جائے گی۔ گوپی چند نارنگ اردو زبان کے گنگا جمنی مزاج کے ایک ایسے پیکر تھے جو سب سے الگ اور سب سے جدا تھا، اس پیکر نے اردو زبان کے فروغ میں جو نمایاں اور ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے اسے وقت کا مورخ کبھی فراموش نہیں کر سکتا ہے۔ وہ جب بولتے تھے تو الفاظ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے نظر آتے تھے، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میٹھے پانی کا ایک چشمہ ابل رہا ہو۔۔۔۔۔

فخرالدین عارفی

ایک مرتبہ ماہنامہ "مریخ" پٹنہ کے مارچ۔ اپریل 2001ء کے شمارے میں سکندر احمد کا ایک مضمون "ما بعد جدیدیت: حقیقت کے آئینے میں" شائع ہوا تھا۔ تب میں ماہنامہ "مریخ" کا نائب مدیر اور پروفیسر عبد المغنی صاحب رسالے کے مدیر ہوا کرتے تھے۔ اس مضمون میں پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کے "ما بعد جدیدیت" کے نظریات سے مختلف مغربی زبانوں کے بڑے ادبا خصوصاً "دریدا" (Derrida) کے نظریات و افکار کا حوالہ دیتے ہوئے سکندر احمد نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کے خیالات و نظریات سے انحراف کیا تھا اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کے نظریات کے مقابلے میں "ما بعد جدیدیت" کے تعلق سے شمس الرحمان فاروقی کے افکار و نظریات سے اپنے اتفاق کا اظہار کیا تھا تب پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب نے "مریخ" کے دفتر کے بیک فون نمبر پر رابطہ کر کے مجھ سے "ما بعد جدیدیت" کے تعلق سے اپنے ادبی موقف کی وضاحت کی تھی اور مضمون کی اشاعت پر اپنی ناراضگی کا بھی اظہار کیا تھا۔ بعد میں اس مضمون کے تعلق سے اشرفی نے مجھے اپنا ایک مضمون بھی حوالے کیا تھا جو سکندر احمد کے مضمون کا جواب تھا اور اس مضمون میں "مابعد جدیدیت" کے سلسلے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کے ادبی موقف کی بھرپور حمایت کی گئی تھی۔ پروفیسر وہاب اشرفی صاحب کے مذکورہ مضمون کو بھی میں نے "مریخ" کے مئی تا ستمبر 2001 کے شمارے میں صفحہ نمبر 9 تا 13 پر شائع کیا تھا۔ مضمون "مابعد جدیدیت اور نارنگ" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کے ساتھ ہی ادارے کی جانب سے ایک نوٹ بھی مضمون کی پیشانی پر شائع ہوا تھا، جو پروفیسر عبد المغنی صاحب نے خود تحریر کیا تھا۔ وہ ادارتی نوٹ ملاحظہ کریں:

"مضمون کا عنوان ادارے نے قایم کیا ہے، اس لیے کہ مراسلے کا مقصود یہی معلوم ہوتا ہے۔ ادارہ مریخ جدیدیت اور ما بعد جدیدیت اور ساختیات، پس ساختیات وغیرہ کے مباحث کو سرے سے مصنوعی سمجھتا ہے۔ یہ مباحث مغرب کی کورانہ تقلید پر مبنی ہیں اور ان کا مقصد اسٹنٹ یا ریکٹ چلانا ہے، جس سے ادب کی فضا خراب ہوتی ہے۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی کا یہ خیال بہر حال صحیح نہیں کہ مذہب کو ادب سے یا ادب کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ مذہب سے الگ ہو کر کوئی بڑا ادب شاید ہی کبھی پیدا ہوا ہو۔ قدامہ اور جرجانی کے بیانات کو بھی، جن کا حوالہ دیا گیا ہے، مضمون نگار کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ (ع۔م)

پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب جب کبھی پٹنہ تشریف لاتے تھے تو میں ان سے لازمی طور پر ملتا تھا۔ یہ ملاقات بسا اوقات کسی ادبی محفل میں ہوتی تھی، لیکن کبھی کبھی خصوصی طور پر بھی ہوتی تھی۔ گوپی چند نارنگ صاحب کے تعلقات پروفیسر عبد المغنی، پروفیسر وہاب اشرفی اور علی الخصوص پروفیسر عبد الصمد صاحب سے بہت زیادہ اچھے اور خوشگوار تھے۔ لہٰذا ان لوگوں کے ہمراہ میری بھی ملاقات اکثر پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب سے ہو جایا کرتی تھی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کو میں اردو ادب کا ایک بڑا ناقد، ادیب اور ماہر لسانیات تسلیم کرتا ہوں۔ ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ مستقبل میں ان کی خدمات کا جب احتساب ہوگا تو ان کا قد مزید بلند و بالا نظر آئے گا۔ ساہتیہ اکادمی کے تعلق سے ان کے سلسلے سے جو بات کہی جاتی ہے، اگر اس کو ہم سچ بھی تسلیم کر لیتے ہیں تو اس سے ان کے ادبی قد پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ دونوں الگ الگ شے ہے۔ انسانی جبلت سے بہر حال انکار اور انحراف ممکن نہیں ہے۔